مولانا سلمان ندوی صاحب کا نیا کتابچہ
تحقیق کی کسوٹی پر

مؤلف:

مولانا رضوان احمد قاسمی

مہتمم جامعہ اسلامیہ محفوظ العلوم للبنات منورواشریف سمستی پور بہار ہند

کتاب کا نام: مولانا سلمان ندوی صاحب تحقیق کی کسوٹی پر

مصنف: مولانا رضوان احمد قاسمی صاحب (دامت برکاتہم)

سن اشاعت نومبر 2018

تمہید وتعارف

علم وتحقیق کے میدان میں ٹھوکر کھا جانا کوئی معیوب چیز نہیں۔ بلکہ ایسا ہوسکتا ہے کہ کسی نے اپنے لحاظ سے مکمل تحقیق کر لی ہو۔تمام زاویئے سے جانچ پرکھ لیا ہو اور تلاش وجستجو میں کوئی کسر نہ چھوڑی ہو اس کے باوجود نتیجہ غلط نکال لے اور قولِ فیصل اختیار کرنے میں غلطی کر بیٹھے۔ ظاہر ہے کہ اِس میں اُس محقّق کا کوئی قصور نہیں۔اسی لئے حدیث پاک کے مطابق ایسا مجتہد بھی ثواب سے محروم نہیں رہتا اور اسے اپنی نیک نیتی کا اجر ضرور ملتا ہے۔لیکن اگر معاملہ برعکس ہے تو یقیناً یہ جرم ہے اور جس کے جیسے حالات ہونگے اسی اعتبار سے اس پر دفعاتِ جرم عائد ہونگے۔کوئی فقط مجرم ہوگا۔کوئی جرمِ عظیم کا مرتکب ہوگا۔کسی کا جرم صرف قابلِ ملامت ہوگا اور کوئی سزائے دار کا مستحق ہوگا۔الغرض محقق کے احوال وکوائف سے فیصلہ کیا جائے گا کہ غلط نتیجہ کے استنباط میں اسے کس درجہ کا مجرم مانا جائے۔کیا اس نے اپنی تحقیق سے لوگوں کی آنکھوں میں دھول جھونکی ہے؟ یا کسی خاص مطمحِ نظر کو فروغ دینے کے لیے یہ شگوفہ چھوڑا ہے؟ کسی امرِ مسلّم کے انکار سے اپنا بڑکپن ظاہر کرنا چاہا ہے؟ یا یہ کہ نیک نیتی میں یہ سب کچھ ہوگیا ہے؟

مولانا سلمان حسینی ندوی صاحب یقیناً ایک متعارَف عالمِ دین ہیں۔میدانِ تحقیق بھی انھوں نے خوب دیکھ رکھا ہے۔ بارہا اس میدان سے وہ گذرتے بھی رہے ہیں۔اسلامی تاریخ کے پیچ وخم سے آشنائی بھی کچھ کم نہیں۔اور حدیث واصولِ حدیث کی تدریس بھی ان کے روز وشب کا معمول ہے....اِن سب کے باوجود یہ بھی ایک حقیقت ہے کہ جمہور کی راہوں کو لات مارنا ان کی عادت سی بن چکی ہے۔متفقہ موقف سے ھٹ کر ایک نئی ڈگر اپنانا ان کا معمول نظر آتا ہے اور اھل سنت والجماعۃ کے مسلّمہ نظریہ پر کوئی نئی تحقیق تھوپنا ان کی فطرتِ ثانیہ محسوس ہوتی ہے۔

ابھی ستمبر 2018 کے اواخر میں انھوں نے شانِ صحابیت کو روندا تھا۔حضرت امیر معاویہ رضی اللہ عنہ کی فضیلت وعظمت کو للکارا تھا۔ان پر سبُّ وشتم کے تیر برسائے تھے اور اپنی حد تک انھوں نے خوب ہاتھ صاف کیا تھا مگر جب ان کی زبان درازی پر جمہور امت نے تُھو تُھو کرنا شروع کر دیا۔چاروں طرف سے ان کی گرفت ہونے لگی۔ان کی بہ نسبت چھوٹے لوگ بھی حُبِّ صحابہ میں کچھ نہ کچھ لکھنے لگے۔خود میں نے بھی ایک مضمون شائع کیا تھا جس کا عنوان تھا....*سلمان کی زد میں ہیں اصحاب پیمبر بھی.......اس طرح خوردوں کے علاوہ اکابر نے بھی جب اپنی خفگی کا اظہار کیا اور اربابِ* دارالعلوم ندوۃ العلماء* نے ان کے متنازعہ بیان سے اپنی برآت کا اعلان کر دیا تو مجبوراً ایک.....اگر.......و.......مگر.....والا رجوع نامہ انھوں نے جاری کیا تاکہ معاملہ سرد پڑ جائے۔نتیجۃً ایسا ہی ہوا اور امت مسلمہ کے موجودہ منتشر حالات کو دیکھتے ہوئے لوگوں نے اس موضوع کو سرد خانے میں ڈال دیا...کہ چلو کوئی بات نہیں۔رجوع کے اسی فریب نامہ اور فریبی ویڈیو کو رجوع سمجھ لو تاکہ غیروں کو ہمیں توڑنے کا موقع نہ مل سکے.......مگر افسوس صد افسوس.....کہ ابھی حال ہی میں 16 صفحات کا ایک نیا کتابچہ منظر عام پہ آیا ہے جس کا نام ہے...* لفظ صحابہ کے بارے میں غلط فہمیاں*...مصنف کی جگہ پہ نام ہے ...*سلمان حسینی ندوی*....کا.....ناشر ہے...* جمعیت شباب الاسلام لکھنؤ*...اور تاریخ اشاعت ہے..اکتوبر 2018ء....

غور کیجئے کہ ماہ ستمبر میں حضرت امیر معاویہ کولعن طعن کرتے ہیں۔رجوع کا ڈھونگ رچاتے ہیں اور پھرفوراً اپنی ایک نئی تحریر کے ذریعے وہی پُرانا راگ الاپنے لگتے ہیں ممکن ہے کہ رجوع کا ڈھونگ بھی اکتوبر ہی کا ہوتا ہم اگر یہ تحریر پہلے کی ہے اور مشروط رجوع بعد کا ہے تو پھر پہلے والی تحریر کونومبر 2018 میں منظرِ عام پہ لانے کا مقصد کیا ہے؟اور پھر سے اپنی ذھنیت کا پرچار کس لئے ہے؟ کیااس سے یہ صاف واضح نہیں ہوجاتا؟ کہ اکتوبر میں جو رجوع کا بیان آیا تھا وہ بھی ایک تبرّ ابازی کے طور پہ تھااور حضرت امیر معاویہ کے تعلق سے ان کی اندرونی کیفیت نے اب لوح وقلم کا لبادہ اوڑھ لیا ہے

زیرِ نظر کتابچہ کا جو موضوع ہے اس سے تو یہ نہیں لگتا کہ یہ تحریر پہلے کی ہے بلکہ اندر کے مشمولات کو دیکھ کر ہر کوئی یہی فیصلہ کرے گا کہ مولانا سلمان نے اپنی سابقہ متعارَف ذھنیت کو نیا رُوپ دیا ہے اور حضرت امیر معاویہ پہ طعن وتشنیع کے لئے گمراہ دلیل پیش کی ہے۔البتہ عنوان بدل ڈالا ہے اور یہ باور کرانے کی کوشش کی ہے کہ لفظ صحابی کا مفہوم سمجھنے میں جمہور امت نے ٹھوکر کھائی ہے اور تمام اہل سنت والجماعت نے لفظ صحابی کی تعریف میں غلو سے کام لیا ہے۔اسی طرح...لاتسُبُّوا.....والی حدیث بھی انھوں نے غلط سمجھی ہے۔علاوہ ازیں قرآن کریم کی سورتوں کے نمبر شمار 114 اور 30 پاروں کی تقسیم کو بھی ماننے سے انکار کر دیا ہے....اس لئے راقم سطور نے سوچا کہ مولانا کا علم وتحقیق اپنی جگہ۔مگران کے پیش کردہ استدلال کا جائزہ بھی لینا چاہیے اور ذرا دیکھنا چاہئے کہ وہ کون سی نئی تحقیق ہے جسے مولانا کے علاوہ آج تک کوئی نہیں جان سکا ہے؟اور کیا واقعۃً صحابی کے مفہوم میں غلو سے کام لیا گیا ہے؟

تو یقین جانئے کہ مولانا کے پیش کردہ دلائل کا جب میں نے اصل ماخذ سے موازنہ کیا تو حیرت واستعجاب کے بحرِ ناپیدا کنار میں ڈوبتا چلا گیا۔اور یہ سوچنے لگا کہ آخر ماجرا کیا ہے؟ کتر وبیونت کا شیوہ تو کسی اور کا ہے۔؟استدلالی خیانت تو کہیں اور ہم نے دیکھی ہے؟اور مرجوح کا انتخاب تو کوئی اور کرتا ہے۔؟ جبکہ مولانا سلمان ندوی تو کسی دوسرے طبقے سے نہیں۔بلکہ خود ہمارے طبقے سے ہیں...پھر ایسا کیوں ہوا؟ کہیں ایسا تو نہیں؟ کہ زبان وقلم سلمان کے ہیں۔دلائل شیطان کے ہیں۔؟ چہرہ سلمان کا ہے۔بولتا کوئی اور ہے؟اور حبِّ اہل بیت کے پردہ میں اعلان ہے شیعیت وسبائیت کا؟...

چنانچہ زیرِ نظر جائزہ میں ہم واضح کریں گے کہ.........صحابی کی تعریف کیا ہے؟ جمہور اہل سنت والجماعت کس تعریف کے قائل ہیں؟ زبان رسالت نے صحابی کسے کہا ہے؟اور مولانا نے صحابی کی تعریف نقل کرنے میں کس قدر خیانت سے کام لیا ہے؟.......حضرت امیر معاویہ رضی اللہ عنہ کی فضیلت کیا ہے؟..........کیا قرآن مجید کی سورتیں 114 نہیں ہیں؟ان کے علاوہ اور بھی دیگر مشمولات کا جائزہ لیا جائے گا۔

صحابی کی تعریف

مولانا سلمان ندوی صاحب اپنے کتابچہ کے ص 9 پہ فرماتے ہیں کہ* اہلِ سنت نے غلو میں یہ نقطہ نظر وضع کرلیا کہ جس نے حضور صلی اللہ علیہ و سلم کا ایک مرتبہ ایک سکنڈ کے لئے بھی دیدار کرلیا اور مسلمان ہونے کی حالت میں اس کی موت ہوئی اور وہ مرتد و کافر ہو کر نہیں مرا۔ وہ صحابی ہے.... یہ تعریف نہ حضور سے منقول ہے نہ خلفاء راشدین سے۔ نہ کسی صحابی سے۔ بعد کے دور میں یہ تعریف وضع کرلی گئی۔ بالکل ایسے ہی جیسے کہ قرآن مجید میں 114 سورتیں ہیں..

مولانا کے مذکورہ اقتباس کو بار بار پڑھئے اور دیکھئے کہ اس چھوٹے سے پیراگراف میں مولانا نے کتنا اہم دعویٰ کیا ہے؟ اس میں ایک تو یہ ہے کہ صحابی کی یہ تعریف اہلِ سنت کی خانہ زاد ہے۔ یہ ایک گھڑی ہوئی اور موضوع تعریف ہے اور اس کی کوئی حقیقت نہیں ہے.......... موضوع ہونے کا مطلب اس لئے نکلتا ہے کہ مولانا نے وضع کا لفظ استعمال کیا ہے اور وضع کا لفظ اگرچہ مقرر کرنے کے معنی میں بھی آتا ہے مگر علم حدیث کے باب میں اس لفظ کا استعمال جب بھی ہوتا تو گھڑنے اور خانہ زاد ہونے کا معنی لیا جاتا ہے۔ اس لئے پہلا دعویٰ یہ ہوگا کہ اہل سنت نے صحابی کی جو تعریف بیان کی ہے وہ خانہ زاد اور موضوع ہے۔

پھر اس دعویٰ کی دلیل میں جو بات کہی گئی ہے وہ بھی کسی دعویٰ سے کم نہیں.... کیونکہ مولانا کی دلیل یہ ہے کہ یہ تعریف نہ حضور سے منقول ہے نہ خلفاء راشدین سے اور نہ کسی صحابی سے....... اور آخر میں ایک اور زبردست دعویٰ کردیا ہے کہ* بالکل ایسے ہی جیسے کہ قرآن مجید میں 114 سورتیں ہیں* یعنی جس طرح 114 سورتوں کا تصور محض خانہ زاد۔ بلا دلیل اور موضوع ہے جو نہ تو حضور سے ثابت ہے نہ خلفاء راشدین سے اور نہ کسی صحابی سے۔ اسی طرح صحابی کی یہ تعریف بھی موضوع ہے...

اب آیئے سب سے پہلے صحابی کی تعریف دیکھتے چلیں کہ اس سلسلے میں جمہور محدثین کیا کہتے ہیں اور فقہاء اصولیین کا ارشاد کیا ہے؟ تو علامہ نووی لکھتے ہیں کہ... اختلف فی حد الصحابی فالمعروف عند المحدثین انه کل مسلم رأی رسول الله صلی الله علیه وسلم .... یعنی محدثین کے یہاں ہر وہ مسلمان جس نے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کو دیکھا وہ صحابی ہے...... جبکہ دوسرے فریق کے بارے میں لکھتے ہیں کہ... وعن أصحاب الأصول اوبعضهم انه من طالت مجالسته علی طریق التبع...... یعنی فقہاء کے یہاں صحابی وہ ہے جسے رسول اللہ کی طویل صحبت ملی ہو الخ ...... تقریب النووی ص 667*

الغرض بنیادی طور پر یہ دو نقطہ نظر ہے۔ کہ فقہاء کے یہاں صحبت ضروری ہے اور وہ بھی طویل صحبت ہونی چاہئے جبکہ محدثین کے یہاں صحابی ہونے کے لئے صرف رویت کافی ہے۔ محدثین کی اسی تعریف کو نقل کرتے ہوئے حافظ سخاوی فرماتے ہیں کہ۔ و ممن نص علی الا کتفاء بها (ای بالروية) احمد فإنه قال من صحبه سنة او شهرا او یوما او ساعة او رآه فهو من اصحابه و کذا قال ابن المدینی. و تبعهما تلمیذهما البخاری.. فتح المغیث ج 4 ص 9.8

مولانا سلمان صاحب نے اصولیین کی تعریف پہ خوب زور دیا ہے اور فرمایا ہے کہ صرف رویت سے صحابیت کا ثبوت نہیں ہوسکتا بلکہ معمولی صحبت بھی کافی نہیں ہے اگر معمولی صحبت ہوگی تو انہیں لغوی صحابی تو کہا جاسکتا ہے مگر اصطلاحی صحابی نہیں کہا جاسکتا.....

مولانا نے اصولیین اور فقہاء محدثین کی تعریف پر جو زور دیا ہے اس سے ہمیں کوئی اختلاف نہیں...... ہاں اگر اختلاف ہے تو اس چیز سے کہ انہوں نے محدثین کی تعریف کو یکلخت اٹھا کر پھینک دیا ہے اور یہ الزام دھر دیا ہے کہ محدثین کی بیان کردہ تعریف کا کوئی ثبوت نہیں مولانا کے اس دعویٰ پر شاید کسی کو ھنسی بھی آجائے کہ یہ تو بالکل الٹی بات ہوگئی۔ ہونا تو یہ چاہئے کہ محدثین کی تعریف مدلل ہو کیونکہ محدثین کے یہاں ظاہر حدیث کی اھمیت زیادہ ہے۔ بغیر کسی روایت کے سامنے ہوتے ہوئے وہ لوگ کوئی متفقہ تعریف وضع کرلیں؟ بڑا عجیب سا لگتا ہے.......... جبکہ فقہاء کا معاملہ دوسرا ہے اس کے باوجود مولانا فرماتے ہیں کہ اصولیین کی تعریف تو ثابت ہے مگر محدثین والی تعریف ثابت نہیں... تو آیئے پہلے یہ دیکھتے ہیں کہ فقہاء والی تعریف کا مولانا کے پاس ثبوت کیا ہے؟

مولانا ندوی نے اپنی پسندیدہ تعریف ثابت کرنے کے لئے حضرت انس بن مالک رضی اللہ عنہ کا ایک قول پیش کیا ہے جسے طبقات ابن سعد کے حوالے سے علامہ سیوطی نے یوں نقل کیا ہے کہ *عن موسی السیلانی قال اتیت انس بن مالك فقلت له انت آخر من بقی من أصحاب رسول الله صلی الله علیه و سلم قال قد بقی قوم من الاعراب فاما من اصحابه فانا آخر من بقی *.....

یہی وہ قول ہے جسے مولانا نے اپنی بات ثابت کرنے کے لیے بطورِ دلیل پیش کیا ہے کہ صحابیت کے لیے صرف دیکھنا کافی نہیں ہے بلکہ صحبت ومعیت بھی ضروری ہے ورنہ حضرت انس نے دوسرے باحیات اور رویتِ زیبا سے سرفراز لوگوں کی صحابیت کا انکار نہ کیا ہوتا......

مگر......... اسی عبارت کے فوراً بعد امام سیوطی نے لکھ ڈالا ہے کہ *قال العراقی والجواب انه أراد إثبات صحبة خاصة لیست لأولئك....... تدریب الراوی ص 670*... یعنی حضرت انس کے اس قول کا مطلب یہ نہیں ہے کہ میرے علاوہ اور کوئی صحابی موجود نہیں ہے بلکہ ان کی مراد یہ ہے کہ میرے علاوہ مخصوص صحبت والے صحابی اور کوئی نہیں ہیں..

حضرت انس کے اس قول میں اگر کوئی تخصیص نہ کی جائے تو العیاذ باللہ آپ کا جھوٹا ہونا لازم آئے گا اس لئے کہ حضرت انس کا انتقال 93ھ میں ہوا ہے جبکہ ان کے کئی سالوں بعد 99ھ میں حضرت محمود بن الربیع کی وفات ہوئی ہے اور یہ وہ صحابی ہیں جن کے ساتھ محض پانچ سال کی عمر میں رسول اللہ کا یہ واقعہ پیش آیا تھا کہ *مجّة مجّها فی وجهی الخ....... بخاری شریف ح 77*

پتہ چلا کہ محمود بن الربیع کی رویت بھی ہے اور صحبت و روایت بھی..... اس کے باوجود حضرت انس کا یہ فرمان کہ میرے علاوہ آپ کے اصحاب میں سے کوئی نہیں ہے کیسے درست ہوسکتا ہے؟۔ اسی طرح حضرت ابوالطفیل عامر بن واثلہ کی وفات بھی بعد میں ہوئی ہے لہٰذا ماننا پڑے گا کہ حضرت انس کا قول اپنے عموم پہ نہیں ہے۔ بلکہ کچھ نہ کچھ اس میں تخصیص ضرور ہے چنانچہ امام عراقی کا قول علامہ سیوطی نے نقل کردیا کہ خاص صحبت والوں کے موجود ہونے کی نفی ہے.. اب ایسے میں ظاہر ہے کہ حضرت انس کے اس قول سے مولانا کی مراد ثابت نہیں ہوسکتی۔ اور شاید اسی لیے انھوں نے امام عراقی کے جواب سے کوئی تعرض ہی نہیں کیا ہے کیونکہ اگر اسے چھیڑتے تو سارا استدلال ہی ھباءً منثوراً ہوجاتا۔

مولانا نے اس موقع سے ایک قول حضرت سعید بن المسیب کا بھی پیش کیا ہے کہ *عن سعید بن المسیب انه لایعد صحابیا

الامن اقام مع رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم سنۃ اوسنتین او غزامعہ غزوۃ او غزوتین*......
مولانا نے ابن المسیب کا یہ قول تو پیش کر دیا مگر یہ نہیں بتایا کہ اس کی حیثیت کیا ہے؟ حالانکہ وہیں پہ اس کی حیثیت بھی واضح کر دی گئی ہے کہ *فإن صح عنہ فضعیف*.......... اور امام سیوطی نے اس کی شرح میں لکھا ہے کہ *قال العراقی لا یصح ھذا عن ابن المسیب....... تدریب الراوی ص 671*........ گو یا ابن المسیب سے اس قول کا ثبوت ہی نہیں ہے اور اگر ثبوت مان بھی لیں تو پھر اس کی سند میں ایک راوی الواقدي بھی ہیں جو حدیث کے باب میں غیر معتبر ہیں کیونکہ امام احمد ابن حنبل فرماتے ہیں کہ یہ کذاب ہے اور امام بخاری فرماتے ہیں کہ متروک الحدیث ہے (تہذیب التہذیب ج9 ص 364)....... اب آپ اندازہ کیجئے کہ مولانا نے جمہور محدثین کے مقابلے میں صحابی ہونے کی جو تعریف پیش کی ہے اس کی دلیل کیسی ہے؟ علاوہ ازیں حضرت انس وابن المسیب کی روایت تو نقل کر دی ہے مگر دونوں پہ جو کلام ہے اسے چھوڑ دیا ہے......
مولانا نے ابوالمظفر السمعانی کے حوالے سے ایک عبارت اور بھی نقل کی ہے کہ* الصحابی من طالت صحبتہ للنبی و کثرت مجالستہ علی طریق التبع لہ والأخذ عنہ*..... اس کے بعد مولانا فرماتے ہیں کہ* یہی قول علامہ آمدی اور ابن الحاجب کا ہے*،،،،،، گو یا آمدی اور ابن حاجب بھی صحابیت کے لیے طویل صحبت۔ اور کثرت مجالست وغیرہ کو ضروری سمجھتے ہیں جبکہ حافظ سخاوی لکھتے ہیں کہ*وقال الآمدی الاشبہ أن الصحابی من راٰہ.....وحکاہ عن احمد وا کثر اصحابنا واختارہ ابن الحاجب ایضاً........ فتح المغیث ج4ص 10*....
اب آپ ہی فیصلہ کیجئے کہ اسے کیا نام دیا جائے۔؟ مولانا کی نقل کو صحیح مانا جائے یا حافظ سخاوی کی نقل کو درست سمجھا جائے؟
یہاں تک گفتگو تھی خود مولانا کی پسندیدہ تعریف کی۔ اب ہمیں یہ دیکھنا ہے کہ جمہور محدثین نے صحابی کی جو تعریف کی ہے اس کا بھی کوئی ثبوت موجود ہے یا نہیں؟ اور کیا واقعی وہ من گھڑت اور بے دلیل ہے؟ تو اس تعلق سے براہ راست دربار رسالت میں حاضری دیتے ہیں اور دیکھتے ہیں کہ ماجرا کیا ہے؟ تو اچانک مسلم شریف کی ایک ایسی روایت کا سراغ مل جاتا ہے جس کی بنیاد پر یہ کہا جا سکتا ہے کہ محدثین کی تعریف تو براہ راست زبان رسالت سے ثابت ہے اور وہ بھی ایسی روایت سے۔ جس کی صحت میں کوئی کلام نہیں... امام مسلم نے باب فضل الصحابہ کے تحت حضرت ابوسعید خدری کی ایک روایت کو دو سند سے نقل کیا ہے آپ پہلے ان دونوں روایات کے الفاظ دیکھئے
*عَنْ أَبِي سَعِيدٍ الْخُدْرِيِّ، عَنِ النَّبِيِّ صَلَّى اللهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ، قَالَ: "يَأْتِي عَلَى النَّاسِ زَمَانٌ، يَغْزُو فِئَامٌ مِنَ النَّاسِ، فَيُقَالُ لَهُمْ: فِيكُمْ مَنْ رَأَى رَسُولَ اللهِ صَلَّى اللهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ؟ فَيَقُولُونَ: نَعَمْ، فَيُفْتَحُ لَهُمْ، ثُمَّ يَغْزُو فِئَامٌ مِنَ النَّاسِ، فَيُقَالُ لَهُمْ: فِيكُمْ مَنْ رَأَى مَنْ صَحِبَ رَسُولَ اللهِ صَلَّى اللهُ عَلَيْهِ وسلم؟ فَيَقُولُونَ: نَعَمْ، فَيُفْتَحُ لَهُمْ، الخ............... * یہی روایت جب دوسری سند سے آتی ہے تو الفاظ قدرے بدل جاتے ہیں
*زَعَمَ أَبُو سَعِيدٍ الْخُدْرِيُّ قَالَ: قَالَ رَسُولُ اللهِ صَلَّى اللهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ: "يَأْتِي عَلَى النَّاسِ زَمَانٌ، يُبْعَثُ مِنْهُمُ

الْبَعْثُ فَيَقُولُونَ: انْظُرُوا هَلْ تَجِدُونَ فِيكُمْ أَحَدًا مِنْ أَصْحَابِ النَّبِيِّ صَلَّى اللهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ؟ فَيُوجَدُ الرَّجُلُ، فَيُفْتَحُ لَهُمْ بِهِ، ثُمَّ الخ... (مسلم شریف ح 2532)

یہاں پہلی روایت کے پہلے سوال پہ غور کیجئے کہ *فیکم من رآی رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم* کا جملہ ہے اور پھر اسی روایت کے دوسرے سوال میں یہ جملہ ہے کہ *فیکم من رآی من صحب رسول اللہ صلی اللہ علیہ و سلم.... گویا پہلے سوال میں جو رسول اللہ کو دیکھنے والے تھے وہی اب دوسرے سوال میں رسول اللہ کے صحابی کہلا رہے ہیں.... پتہ چلا کہ محض دیکھنے والا بھی صحابی رسول ہے..

اور دوسری روایت میں تو پہلے ہی سوال میں زیارت رسول کرنے والے کو صحابی کہا گیا ہے..........اب اگر اسے روایت بالا لفاظ کہئے تو گویا محدثین نے جو تعریف کی ہے وہ تعریف خود رسول اللہ نے فرما رکھی ہے اور اگر روایت بالمعنی مانئے تو محدثین والی تعریف بھی کوئی خانہ زاد نہیں بلکہ خود صحابی رسول سے منقول ہے۔اس کے باوجود اگر محدثین کی تعریف کو موضوع اور خانہ زاد کہا جائے تو میں سمجھتا ہوں کہ یہ سراسر علمی دیانت کا خون اور فضول کی بکواس کے سواء کچھ نہیں۔

الفِئَةُ الْبَاغِيَةُ کون ہے؟

مولانا سلمان ندوی صاحب اپنے نئے کتابچہ میں لکھتے ہیں کہ (........دوسری طرف بہت سے لوگوں کا بغیر نام لئے اور کسی کسی کا نام لے کر مذمت کے ساتھ (آپ) نے ذکر فرمایا ہے ایک موقع پر آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے ارشاد فرمایا تھا جو متعدد سندوں سے منقول ہے کہ *ان عمارا تقتله الفئة الباغية* اس طرح آپ نے حضرت معاویہ اور ان کے لشکر کے حضرت علی کے مقابلہ میں باغی ہونے کی صراحت کر دی تھی اور حضرت عمار حضرت علی کے ایک لشکر کے کمانڈر تھے......لفظ صحابہ کے بارے میں غلط فہمیاں ص 4)

گویا مولانا ندوی کے نزدیک آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے اس حدیث میں حضرت معاویہ کا نام لئے بغیر ان کی مذمت فرمائی ہے اور *الفئة الباغية* کا مصداق حضرت معاویہ اور ان کا لشکر ہے.....

مولانا ندوی کے علاوہ اگر کوئی دوسرا ناواقف انسان یہ بات کہتا تو ہرگز تعجب نہ ہوتا لیکن چونکہ مولانا کو فہم حدیث میں بھی اچھی مہارت ہے اس لئے حیرت ہے کہ انھوں نے حضرت امیر معاویہ اور ان کے لشکر کو اس حدیث کا مصداق کیسے بنا دیا؟ جبکہ معاملہ اتنا سنگین ہے کہ جو بھی اس حدیث کا مصداق ہوگا وہ یقیناً جہنمی ہوگا۔اور جو بھی حضرت عمار کا قاتل ٹھہرے گا یقیناً اس کا دین میں کوئی حصہ نہیں ہوگا اس کے باوجود مولانا نے آسانی سے فکس کر دیا کہ اس حدیث کا مصداق سو فیصد حضرت معاویہ اور ان کا لشکر ہے۔حالانکہ حضرت معاویہ خود انکاری ہیں کہ *أَوَنَحْنُ قَتَلْنَا عَمَّارًا؟*........ارے کیا ہم نے عمار کو قتل کیا ہے؟ بلکہ تاریخ نے تو حضرت امیر معاویہ کا یہ دعویٰ بھی محفوظ رکھا ہے کہ *انما قَتَلَ عَمَّارًا مَنْ جاءَ به*........یعنی عمار کو جو لیکر آئے ہیں انہوں نے ہی ان کو قتل کیا ہے.....*البدایه و النهایه. ج. 7. ص 269. مجمع الزوائد ح 15618*

مولانا ندوی کے لحاظ سے اگر *الفئة الباغية* کا مصداق حضرت امیر معاویہ ہیں تو پھر معاملہ یہیں پہ ختم نہیں ہوتا بلکہ اس کی تان تو

ٹوٹتی ہے صاحبزادہ محترم .نواسہ رسول حضرت حسن رضی اللہ تعالیٰ عنہ پر بھی.... کیونکہ (العیاذ باللہ) حضرت امیر معاویہ کا جب باغی اور جہنمی ہونا فکس ہو چکا تو پھر آپ نے ان سے مصالحت کیوں کی تھی؟ اور انہیں اپنا امیر المومنین کیوں بنایا تھا؟ بلکہ مولانا ندوی کے اس فیصلے کی دھمک خود ذات رسالت تک پہونچتی ہے کیونکہ آپ نے حضرت حسن کے لئے یہ پیشین گوئی فرمائی تھی کہ* إِنَّ ابْنِي هَذَا سَيِّدٌ وَلَعَلَّ اللَّهَ أَنْ يُصْلِحَ بِهِ بَيْنَ فِئَتَيْنِ عَظِيمَتَيْنِ مِنَ الْمُسْلِمِينَ........بخاری شریف ح 2704*

یہاں نبی پاک نے مصالحت کرانے والے کو اگر سید کہا ہے تو جن کے درمیان مصالحت ہو رہی ہے انہیں مسلمان اور فرمانبردار بھی فرمایا ہے۔اس لئے غور کرنے کا مقام ہے کہ نبی رحمت تو اس جماعت کو اطاعت شعار اور مسلمان کہیں اور مولانا ندوی انہیں باغی اور جہنمی ٹھہرائیں؟ کیا مولانا کے اس فیصلہ سے فرمان رسول مجروح نہیں ہوتا؟

خود حضرت عمار رضی اللہ تعالیٰ عنہ کا واقعہ ہے کہ ایک مرتبہ وہ سخت بیمار ہو گئے اور ان کی نگہداشت کرنے والے گھبرانے لگے تو آپ نے فرمایا کہ* لاموت فی مرضی حدثنی حبیبی رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم أنی لاموت الاقتلا بین فئتین مؤمنین*.......(تاریخ صغیر للبخاری ص 42) یعنی میری موت اس بیماری میں نہیں آئیگی کیونکہ میرے محبوب رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے میرے حق میں یہ فرما رکھا ہے کہ میری موت قتل سے ہوگی اور وہ قتل بھی دو مؤمن جماعتوں کے درمیان ہوگا.......الغرض جس کے قتل کو لیکر حضرت امیر معاویہ کو باغی کہا جا رہا ہے وہ خود بھی باہم قتال کرنے والی دونوں جماعت کو مؤمن فرما رہے ہیں....اس کے باوجود حضرت معاویہ کو باغی قرار دینا تحکم نہیں تو اور کیا ہے؟

حضرت عمار کے الفاظ پہ غور کیجئے کہ انھوں نے یہ نہیں کہا کہ ان دونوں جماعتوں میں سے کوئی ایک انہیں قتل کرے گی بلکہ یہ کہا ہے کہ ان دونوں کے درمیان وہ قتل کئے جائیں گے اشارۃً معلوم ہو گیا کہ دو مؤمن جماعتوں کے درمیان جنگ چھڑی ہوگی اسی دوران کوئی تیسرا انہیں قتل کرے گا۔اگر یہ مطلب ہوتا کہ ان ہی دو جماعتوں میں سے کوئی قتل کرے گی تو آپ* بین فئتین *نہیں فرماتے بلکہ* فی فئتین* فرماتے.......اس لئے محض حضرت علی کے لشکر میں ہوتے ہوئے حضرت عمار کا شہید ہو جانا کسی طرح بھی لشکر معاویہ کو الفئۃ الباغیہ نہیں بناتا اور لشکر معاویہ کا مدمقابل ہونا ہرگز انہیں قاتل نہیں ٹھہراتا

لیکن اب سوال یہ ہے کہ جب حضرت معاویہ حضرت عمار کے قتل سے انکار کر رہے ہیں اور قرائن وشواھد بھی حضرت معاویہ کا ساتھ دے رہے ہیں۔تو آخر قاتل کون ہے؟ اور وہ کون سا گروہ ہے جو الفئة الباغيه کا مصداق ہے؟۔تو اس کا جواب یہ ہے کہ حضرت عمار کے سلسلے میں جو ارشاد رسول ہے کہ *تقتلك الفئة الباغية* اس میں* الفئة الباغية* کی پہچان* قتل عمار* نہیں ہے بلکہ* الفئة الباغيه* کی پہچان حقیقت میں* ذو الثديه المخدجی* ہے یعنی* ذو الثديه المخدجی* جس جماعت میں رہتے ہوئے قتل کیا جائے گا وہ جماعت* الفئة الباغية* کہلائے گی حضرت عمار کو تو صرف قاتل کی خبر دی گئی ہے کہ تمہارا قاتل* الفئة الباغية* ہوگی۔اس کی مختصر تفصیل یہ ہے کہ ارشاد رسول* تقتلك الفئة الباغية* کا تذکرہ کبھی* الف لام* کے ساتھ ہوا ہے اور کبھی بغیر الف لام کے۔ چنانچہ مسلم شریف حدیث نمبر 2915 میں *فئةٌ باغيةٌ* ہے اور حدیث نمبر 2916 میں* الفئةُ الباغيةُ* ہے اور ظاہر

ہے کہ نکرہ ومعرفہ دونوں اگر ایک ہی چیز کے لئے استعمال ہوتو نکرہ کو معرفہ پہ محمول کیا جاتا ہے گویا جس* الفئة الباغية* کو اللہ کے رسول نے حضرت عمار کا قاتل کہا ہے وہ کوئی اجنبی اور نا معلوم جماعت نہیں بلکہ صحابہ کے درمیان وہ ایک معروف جماعت تھی۔ اور وہ ہے خوارج کی جماعت۔

چنانچہ ایک حدیث میں آتا ہے کہ

عَنْ سُوَيْدِ بْنِ غَفَلَةَ، قَالَ: سَأَلْتُ عَلِيًّا عَنِ الْخَوَارِجِ، قَالَ: جَاءَ ذُو الثُّدَيَّةِ الْمُخْدَجُ إِلَى رَسُولِ اللَّهِ صَلَّى اللهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ وَهُوَ يَقْسِمُ فَقَالَ: كَيْفَ تَقْسِمُ، وَاللَّهِ مَا تَعْدِلُ؟ فَقَالَ: «مَنْ يَعْدِلُ؟» قَالَ: فَهَمَّ بِهِ أَصْحَابُهُ، فَقَالَ: «دَعُوهُ، سَيَكْفِيكُمُوهُ غَيْرُكُمْ، يُقْتَلُ فِي الْفِئَةِ الْبَاغِيَةِ، يَمْرُقُونَ مِنَ الدِّينِ كَمَا يَمْرُقُ السَّهْمُ مِنَ الرَّمِيَّةِ، قِتَالُهُمْ حَقٌّ عَلَى كُلِّ مُسْلِمٍ ... السنة لابن ابی عاصم ح 911........ یعنی حضرت سوید بن غفلہ نے حضرت علی سے خوارج کے بارے میں دریافت کیا تو حضرت علی نے فرمایا کہ ذوالثدیہ المخدجی نام کا ایک شخص رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے پاس آیا درآنحالیکہ آپ مال غنیمت تقسیم کررہے تھے تو اس نے کہا کہ آپ کیسے تقسیم کررہے ہیں؟ بخدا آپ انصاف نہیں برت رہے ہیں تو آپ نے فرمایا کہ پھر بھلا کون انصاف کرے گا؟ (ذوالثدیہ کی اس بے ادبی پر) صحابہ نے کچھ کرنا چاہا تو آپ نے فرمایا کہ اسے چھوڑ دو۔ تمہاری طرف سے کوئی اور اس کے لئے کافی ہوگا۔ یہ شخص الفئۃ الباغیہ میں قتل کیا جائے گا اور وہ الفئۃ الباغیہ دین سے ایسا نکل جائے گی جیسے تیر کمان سے نکلتا ہے اس باغی جماعت سے قتال کرنا ہر مسلمان پر لازم ہوگا

اس روایت میں ذوالثدیہ المخدجی کے بارے میں صراحت کے ساتھ بیان کردیا گیا ہے کہ وہ الفئة الباغيه میں قتل کیا جائے گا۔ یعنی جس جماعت میں یہ ہوگا وہ جماعت الفئة الباغيه ہوگی..... نیز اس جماعت کی ایک پہچان اور بتلادی گئی کہ یمرقون من الدین کما یمرق السهم من الرمیۃ یعنی وہ جماعت دین سے نکل جائے گی۔ گویا الفئة الباغيه کی ایک پہچان یہ ہوئی کہ اس کا ایک فرد المخدجی ہوگا اور دوسری پہچان یہ ہوگی کہ وہ مارقہ یعنی دین سے نکل جانے والی ہوگی........

ایک دوسری روایت میں ذو الثدية المخدجی اور اس جماعت باغیہ کی مزید وضاحت اس طرح آئی ہے کہ

يخرج قوم من أمتي يقرؤن القرآن ليس قراءتكم إلى قراءتهم بشيء ولا صلاتكم إلى صلاتهم بشيء ولا صيامكم إلى صيامهم بشيء، يقرؤن القرآن يحسبون أنه لهم وهو عليهم، لا تجاوز صلاتهم تراقيهم، يمرقون من الإسلام كما يمرق السهم من الرمية، لو يعلم الجيش الذين يصيبونهم ما قضى لهم على لسان نبيهم لاتكلوا عن العمل، وآية ذلك أن فيهم رجلا له عضد ليس له ذراع، على رأس عضده مثل حلمة الثدي، عليه (كنز العمال ح 30959).....

یعنی میری امت میں سے ایک قوم ایسی نکلے گی جو قرآن۔ نماز۔ روزہ وغیرہ سب کچھ کرتی ہوگی مگر یہ چیزیں ان کے حلق سے اوپر ہی رہیں گی اندر نہیں اتریں گی اور ہمارا وہ لشکر جو ان سے بھڑے گا اگر جان لے کہ اس سے جنگ لڑنے کی کیا فضیلت ہے تو وہ ہر عمل کو چھوڑ کر صرف اسی

جنگ پر تکیہ کر بیٹھے۔اس قوم کی علامت یہ ہوگی کہ اس میں ایک آدمی ایسا ہوگا جس کے ہاتھ پیدائشی طور پر کٹے ہوئے ہونگے الخ......

اسی الفئة الباغيه کی ایک علامت یہ بھی ہے کہ ان کا یونیفارم سر منڈانا ہوگا*إن ناسا من أمتي سيماهم التحليق، يقرؤن القرآن لا يجاوز حلاقيمهم يخرجون من الدين كما يخرج السهم من الرمية(کنز العمال ح 30944)*..

اب اسی کے ساتھ نبی کریم صل اللہ علیہ وسلم کا وہ ارشاد بھی ملا لیجئے جس میں آپ نے پیشین گوئی فرمائی ہے کہ اس جماعت مارقہ۔ جماعت باغیہ اور مخدجی کی جماعت سے کون قتال کرے گا؟

تمرق مارقة عند فرقة من المسلمين فيقتلها أولى الطائفتين بالحق(کنز العمال 30948)

یعنی مسلمانوں کی دو جماعتوں میں سے وہ جماعت اس مارقہ سے قتال کرے گی جو حق سے زیادہ قریب ہوگی۔ گویا مسلمانوں کی دو جماعت رہے گی مگر اس مارقہ سے قتال وہی کرے گی جو زیادہ حق پر ہوگی۔ پتہ چلا کہ دوسری مسلم جماعت بھی گمراہ نہیں ہوگی بلکہ حق پر ہی ہوگی مگر قتال کرنے والی مسلم جماعت زیادہ حق پر ہوگی......

اب ہمیں غور کرنا ہے کہ وہ کون سی جماعت ہے جس نے اس الفئة الباغيه اور الجماعة المارقة سے قتال کیا ہے؟ تو تاریخ وآثار بتلاتے ہیں کہ وہ حضرت علی رضی اللہ عنہ کی جماعت ہے جس نے صفین کے بعد فرقہ خوارج سے قتال کیا ہے چنانچہ ایک جنگ لڑی گئی ہے جس کا نام ہے جنگ نہروان۔اس جنگ کے بعد حضرت علی رضی اللہ عنہ نے خاص طور پر اسی المخدجی کو تلاش کروایا ہے تا کہ سامنے والی جماعت کا الفئة الباغيه ہونا طے ہوجائے اور ان سے قتال کی جو فضیلت مشہور تھی اس کے حصول کا یقین ہوجائے۔اس تعلق سے مختلف کتب حدیث میں روایات موجود ہیں البتہ صرف ایک روایت سامنے رکھئے کہ*عَنْ عَبِيدَةَ، قَالَ: "لَمَّا فَرَغَ عَلِيٌّ رَضِيَ اللهُ عَنْهُ مِنْ أَصْحَابِ النَّهَرِ، قَالَ: ابْتَغُوا فِيهِمْ إِنْ كَانُوا الْقَوْمَ الَّذِينَ ذَكَرَهُمْ رَسُولُ اللهِ صَلَّى اللهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ، فَإِنَّ فِيهِمْ رَجُلًا مُخْدَجَ الْيَدِ، أَوْ مُودَنَ الْيَدِ، أَوْ مَثْدُونَ الْيَدِ، فَابْتَغَيْنَاهُ فَوَجَدْنَاهُ فَدَعَوْنَاهُ إِلَيْهِ، فَجَاءَ حَتَّى قَامَ عَلَيْهِ، فَقَالَ: اللهُ أَكْبَرُ اللهُ أَكْبَرُ ثَلَاثًا، وَاللهِ لَوْلَا أَنْ تَبْطَرُوا لَحَدَّثْتُكُمْ بِمَا قَضَى اللهُ عَلَى لِسَانِ رَسُولِ اللهِ صَلَّى اللهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ لِمَنْ قَتَلَ هَؤُلَاءِ، قُلْتُ: أَنْتَ سَمِعْتَ هَذَا مِنْ رَسُولِ اللهِ صَلَّى اللهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ؟ قَالَ: إِي وَرَبِّ الْكَعْبَةِ، ثَلَاثَ مَرَّاتٍ" وَأَخْرَجَهُ مُسْلِمٌ مِنْ وَجْهَيْنِ آخَرَيْنِ(دلائل النبوة للبيهقي ج5ص185)*

مذکورہ بالا تفصیلات سے واضح ہوگیا کہ الفئة الباغيه سے مراد حضرت امیر معاویہ کا لشکر نہیں بلکہ وہ تیسرا گروہ ہے جسے فرقہ خوراج کہئے یا عبداللہ بن سبا یہودی کی جماعت سمجھئے۔اسی جماعت نے حضرت عمار کو قتل کیا تھا اور یہی جماعت الفئة الباغيه کا مصداق ہے اور جسکا ایک فرد ذو الثدیہ المخدجی ہے اسی کو مخدج الید۔مودن الید۔اور مثدون الید وغیرہ مختلف ناموں سے یاد کیا گیا ہے۔

سب وشتم کے جواز کی بے جا تاویل

پتہ نہیں اچھے بھلے حضرات بھی افواہوں پہ کیوں یقین کر بیٹھتے ہیں؟اور بے سر وپیر کے مفروضے پر اپنی پوری عمارت کھڑی کر دیتے ہیں؟ حالانکہ وہ بھی جانتے ہیں کہ بنیاد اگر ٹیڑھی ہوگی تو دیوار بھی اخیر تک ٹیڑھی ہی رہے گی۔اس لئے اولین کام یہ ہونا چاہئے کہ بنیاد ہی مضبوط ومستحکم ہو ورنہ ہوا کا معمولی جھونکا بھی اسے متاثر کرسکتا ہے۔

حضرت امیر معاویہ کے سلسلے میں ایک جملہ مشہور ہے کہ*لا یصح عن النبی صلی اللہ علیہ وسلم فی فضل معاویۃ بن ابی سفیان شئ*....یعنی حضرت معاویہ کے سلسلے میں نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم سے کوئی صحیح چیز منقول نہیں۔

مولانا سلمان ندوی صاحب بھی اس مفروضہ سے کافی متاثر ہیں اور اسی کو حرف آخر سمجھ کر اپنے نئے کتابچہ میں لکھتے ہیں کہ*لیکن فتح مکہ کے موقع پر اسلام لانے والوں کو طلقاء کہا جاتا ہے ان کی فضیلت زبان نبوت سے بیان نہیں کی گئی۔امام اسحاق بن راھویہ کہتے ہیں کہ معاویہ کے فضائل کے بارے میں ایک حدیث بھی صحیح نہیں....دیکھئے تاریخ ابن کثیر تذکرہ معاویہ..............(ص 8)*

اس پیراگراف میں گہرائی سے اگر غور کیا جائے تو مولانا ندوی کی ذھنیت کا بخوبی اندازہ ہوسکتا ہے مثلاً مولانا نے دستِ رسالت پہ ایمان لانے والوں کا ایک دوسرا نام ہمارے سامنے رکھا ہے اور کہا ہے کہ فتح مکہ سے پہلے والے مسلمان تو یقیناً صحابہ ہیں لیکن فتح مکہ کے بعد اسلام قبول کرنے والے مسلمان صحابہ نہیں ہیں بلکہ طلقاء ہیں اور چونکہ سبُّ وشتم کی مخصوص ممانعت یعنی* لاتسبوا اصحابی* کا تعلق صحابہ سے ہے۔طلقاء سے نہیں ہے۔اس لئے حضرت معاویہ کے تعلق سے کوئی نامناسب تبصرہ کرنا*لاتسبوا اصحابی* کے خلاف نہیں....علاوہ ازیں مولانا ندوی کے نزدیک زبان رسالت نے طلقاء کی کوئی فضیلت ہی بیان نہیں کی ہے اس لیے حضرت معاویہ کی بھی کوئی فضیلت ثابت نہیں ہے اور پھر اپنے اس دعویٰ کو مدلل کرتے ہوئے حضرت اسحاق بن راھویہ کا قول پیش کردیا ہے

مولانا ندوی نے اس نئے نام کا جو انکشاف کیا ہے وہ اگرچہ غیر شرعی نہیں ہے بلکہ متعدد صحیح احادیث میں یہ تقسیم موجود بھی ہے کہ جو لوگ فتح مکہ کے موقع سے مسلمان ہوئے ہیں وہ طلقاء ہیں لیکن اس کا یہ مطلب نہیں کہ وہ فہرست صحابہ سے خارج ہیں بلکہ یہ تقسیم تو محض امتیاز کے لیے ہے جیسے صحابہ کی ایک جماعت مہاجرین کی ہے تو دوسری جماعت انصار کی۔اسی طرح فتح مکہ کے موقع پر جب آپ نے مؤاخذہ نہیں کیا اور سبھوں کے لیے عام معافی اور آزادی کا اعلان کردیا تو وہ سب کے سب طلقاء کہلائے...

مگر زیر نظر اقتباس کا جو پس منظر ہے اس سے صاف ظاہر ہے کہ یہاں پہ طلقاء کا لفظ صحابہ کے مقابلہ میں بولا گیا ہے اور بعد الفتح کے مسلمانوں کو درجہ صحابیت سے الگ کرنا مقصود ہے اس لیے مولانا کی یہ تقسیم اگر اسی نقطہ نگاہ سے مان لی جائے تو نہ جانے کتنوں کی تصنیفات کو حرف غلط کی طرح مٹانا پڑے گا اور بڑے بڑوں کی تحقیق میں ہچکولے آجائیں گے کیونکہ جن اکابر علماء نے صحابہ کرام کے احوال پر کتابیں تصنیف کی ہیں اور قبل الفتح اور بعد الفتح کے تمام نفوس کو صحابہ کہہ ڈالا ہے ان کی تحقیق وتصنیف کو غلط مانے بغیر کوئی چارہ کار نہیں رہے گا اور* ابن سعد کی الطبقات ہو یا ابن عبدالبر کی الاستیعاب۔ابن حجر کی الإصابۃ ہو یا ابن اثیر کی اسد الغابہ اسی طرح ابونعیم کی معرفۃ

الصحابہ ہو یا دوسرے مصنفین کی دوسری کتب* ... ہر ایک پہ خاک ڈالنی پڑے گی۔ اور ہر ایک سے یہ کہنا پڑے گا کہ حضور! آپ تو ابھی طفل مکتب ہیں۔ آپ نے تو اتنی معمولی بات بھی نہیں سمجھی اور اپنی کتابوں میں قبل الفتح اور بعد الفتح کے تمام مسلمانوں کو صحابہ بنا ڈالا.. حالانکہ فتح مکہ کے بعد کے مسلمانوں کو صحابہ نہیں کہا جاتا وہ تو طلقاء ہیں۔ جب آپ کو نام ولقب کی تحقیق نہیں تو پھر کتاب کیسے لکھ ماری؟
اسی طرح مولانا ندوی نے کتنی بے باکی سے یہ فرمادیا ہے کہ فتح مکہ کے موقع سے اسلام لانے والوں کے لیے زبان نبوت نے کوئی فضیلت ہی بیان نہیں کی۔ حالانکہ اگر تلاش کیا جائے تو دسیوں مثالیں ایسی مل جائیں گی جن میں فتح مکہ اور اس کے بعد حلقہ بگوش اسلام ہونے والوں کو زبان رسالت نے سند فضیلت دی ہے* مشتے نمونہ از خروارے* یہ عرض ہے کہ ابھی میرے سامنے مولانا شاہ معین الدین ندوی رحمہ اللہ کی مشہور ومعروف کتاب* سیر الصحابہ* کی چوتھی جلد ہے۔ یہ وہ جلد ہے جو خاص طور پر صغار صحابہ اور اخیر میں اسلام لانے والوں کے حالات پر مشتمل ہے۔ اس میں وفات نبوی سے صرف چند ماہ قبل اسلام لانے والے حضرت جریر بن عبداللہ البجلی کے بارے میں لکھا ہے کہ ایک موقع سے اللہ کے رسول خطبہ دے رہے تھے اور حضرت جریر بھی مسجد کی طرف آرہے تھے کہ آپ نے دوران خطبہ یہ ارشاد فرمایا کہ* ابھی اس دروازہ سے تمہارے پاس یمن کا ایک بہترین شخص داخل ہوگا جس کے چہرہ پر بادشاہی کی علامت ہوگی
(سیر الصحابہ ج 4 حصہ 7 ص 285 بحوالہ مسند احمد)
حضرت عتاب بن اسید کو ایک موقع سے آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے شہر مکہ کی امارت سونپی تو آپ نے حضرت عتاب کی عزت افزائی کرتے ہوئے فرمایا کہ* جانتے ہو میں نے تم کو اھل اللہ پر عامل بنایا ہے اگر تم سے زیادہ موزوں کوئی شخص ہوتا تو اسی کو عامل بناتا۔
(سیر الصحابہ ح 7 ص 378)
حضرت ضماد بن ثعلبہ کے بارے میں مولانا شاہ معین الدین ندوی لکھتے ہیں کہ* خود زبان وحی والہام نے انہیں سمجھداری کی سند عطا کی تھی
(سیر الصحابہ حصہ 7 ص 347)
حضرت عثمان بن ابوالعاص کے بارے میں ہے کہ* حضرت عثمان گو آخری زمانہ میں مشرف باسلام ہوئے لیکن نہایت زیرک ودانا تھے آنحضرت نے بنوثقیف کی امارت پر سرفراز فرماتے وقت انہیں: زیرک: کی سند عطا فرمائی تھی۔
(سیر الصحابہ ح 7 ص 383 بحوالہ طبقات ابن سعد)
حضرت ابوسفیان بن حارث کے بارے میں شاہ ندوی رقم طراز ہیں کہ* آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم انہیں فرط محبت سے: خیر اھلی: کہا کرتے تھے۔ (سیر الصحابہ ح 7 ص 475 بحوالہ مستدرک حاکم)
ان چند مثالوں کو سامنے رکھئے اور بتلائیے کہ* خیر اھلی* کا جملہ سند فضیلت نہیں ہے تو اور کیا ہے؟* انہ کیس*۔ اور* خیر من الیمن* کے جملے کو آپ کیا کہیں گے؟ اور اھل اللہ یعنی اھل مکہ کا گورنر بناتے ہوئے* موزوں ترین شخصیت* کی شہادت کیا کہلائے گی؟ کیا یہ سب طلقاء کے لیے زبان رسالت سے فضیلت کا اظہار نہیں ہے؟ اب آپ ہی فیصلہ کیجئے کہ مولانا شاہ معین الدین ندوی تو احادیث کی روشنی میں برملا اعتراف کریں اور مولانا سلمان ندوی صاحب بلاکسی دلیل کے انکار کر جائیں۔ تو ایسے میں حق پر کون ہے؟ اور ناحق کون؟

مولانا ندوی نے اپنے مذکورہ پیرا گراف کو اگر عام رکھا ہوتا تو شاید اتنی توجہ نہ ہوتی مگر انھوں نے سبھوں کو چھوڑ کر صرف حضرت امیر معاویہ کو چھیڑا ہے گویا بغض معاویہ کی بھڑاس نکالنے کے لیے امام اسحاق بن راھویہ کا قول پیش کیا ہے کہ معاویہ کے فضائل کے بارے میں ایک حدیث بھی صحیح نہیں..

سوال یہ ہے کہ حضرت اسحاق بن راھویہ نہ تو کوئی صحابی ہیں اور نہ کوئی تابعی. پھر آپ کے نزدیک ان کی بات کیسے سند بن گئی؟ جبکہ ان سے پہلے کے بے شمار لوگوں نے حضرت امیر معاویہ کے گُن گائے ہیں. ان کے فضائل ومناقب پہ کتابیں لکھی ہیں اور ثابت کیا ہے کہ سیدنا امیر معاویہ کا مقام ومرتبہ کیا ہے؟ مگر آپ نے سبھوں کو چھوڑ کر صرف ایک کا قول اپنالیا....اور وہ بھی اس گمان سے...کہ حضرت امیر معاویہ نے فتح مکہ کے موقع سے اسلام قبول کیا تھا لہذا یہ بھی صحابہ میں سے نہیں بلکہ طلقاء میں سے ہیں........اسی خیال سے آپ نے ابن راھویہ کا قول منتخب کیا ہے جبکہ خود حضرت معاویہ کا یہ کہنا ہے کہ* میں تو عمرۃ القضاء سے پہلے ہی مسلمان ہو چکا تھا لیکن اپنے اسلام کو میں نے ظاہر نہیں کیا تھا (الاصابۃ لابن حجر ج6 ص120 ح8087)

گویا قبول اسلام تو حدیبیہ کے بعد ہی ہو چکا تھا البتہ ظہور اسلام فتح مکہ کے موقع سے ہوا ہے. اب اگر صحابہ کے مقابلہ میں طلقاء کی تقسیم مان بھی لی جائے تو نفس الأمر میں آپ فتح مکہ سے پہلے والے ہیں نہ کہ بعد والے. اس لئے ظاہر اُطلقاء کی فہرست میں ہوتے ہوئے بھی آپ طلیق نہیں ہیں بلکہ یوں سمجھنا چاہیے کہ جیسے حضرت عباس بن عبد المطلب (عم رسول) نے اپنے سینے میں بہت پہلے سے اسلام چھپا رکھا تھا اور فتح مکہ کے موقع سے اسے ظاہر کیا اسی طرح حضرت معاویہ نے بھی برضا ورغبت اسلام پہلے ہی قبول کر رکھا تھا. البتہ ظاہر کیا ہے فتح مکہ کے موقع سے....

اب آیئے دیکھتے ہیں کہ حضرت امیر معاویہ کے لیے کچھ فضائل ثابت ہیں بھی یا نہیں؟ اور ان کے دامن کے لئے مدح ومنقبت کے کتنے پاکیزہ پھول چنے جا سکتے ہیں؟

فضائل حضرت امیر معاویہ

مولانا سلمان ندوی صاحب نے اپنے کتابچے کے ص 8 پر یہ دعویٰ کیا ہے کہ حضرت امیر معاویہ کے فضائل میں کوئی صحیح حدیث ثابت نہیں.....اس لئے یہ عرض ہے کہ جو لوگ اپنے کو سید کہتے ہیں. طبقہ سادات سے رشتہ جوڑتے ہیں اور لفظ سید کو اپنے نام کا جزو لاینفک بناتے ہیں. ان سے ذرا پوچھئے کہ سید کی فضیلت کیا ہے؟ اور کس وجہ سے آپ کو اپنے سید ہونے پہ ناز ہے. تو بلا جھجھک وہ یہی کہیں گے کہ ہمارا رشتہ اہل بیت سے ہے. ہمارا خاندانی تعلق آل رسول سے ہے اور ہم بھی اسی خانوادہ سے مربوط ہیں جسے عترت رسول کہا جاتا ہے.

گویا نبی سے رشتہ ہے تو فضیلت ہے. اور نبی کی اولاد سے نسبت ہے تو عزت ہے.

اس وقت پہلا سوال یہ ہوگا کہ کیا آپ کے پاس نسب نامہ بھی موجود ہے یا نہیں؟ اگر خوش قسمتی سے نسب نامہ موجود ہے تو دوسرا سوال یہ ہوگا. کہ کیا سیدوں کے لیے زبان رسالت نے کوئی فضیلت بیان کی ہے یا نہیں؟ اگر زبان رسالت نے حسب ونسب کے لحاظ سے کسی کو سید

کہا ہوگا یا نسبی اعتبار سے لفظ سید کی کوئی فضیلت بیان کی ہوگی ۔تب تو سادات کی فضیلت مسلّم ہے لیکن بات اگر خاندان اہل بیت کی ہے اور ہاشمی وقریشی کی ہے تو مجھے یہ کہنے کی اجازت دیجئے کہ فضیلت کسی سید کی نہیں بلکہ آل رسول کی ہے اور عظمت وبرتری کے تمام ترقصیدے سادات کے لیے نہیں بلکہ ہاشمی وخاندان رسول کے لئے ہیں ۔کیونکہ بحیثیت حسب ونسب کسی کو بھی سید نہیں کہا گیا ہے اور زبان رسالت نے کسی کو بھی نسب کے اعتبار سے لفظ سید کا ٹائٹل نہیں دیا ہے ۔بلکہ بحیثیت نسب لفظ سید کا ٹائٹل سراسر ایجاد بندہ اور اہل تشیع کا اختراع ہے

خلاصہ یہ ہے کہ اگر نسبی رشتہ کی بنیاد پر کسی کو فضیلت مل سکتی ہے تو کیا سسرالی رشتہ کو فضیلت کی بنیاد نہیں بنا سکتے ؟ جبکہ سسرالی (دامادی) رشتہ کو بھی قرآن کریم نے نسبی رشتوں کے ساتھ ہی بیان کیا ہے* فَجَعَلَہٗ نَسَباً وَّصِھْراً.... سورہ فرقان آیت 54 *....لہذا جب سسرالی رشتہ کی خود پروردگار نے تعریف کی ہے تو پھر حضرت امیر معاویہ کی عینی بہن حضرت ام حبیبہ جب کاشانہ نبوت میں آگئیں اور حضرت امیر معاویہ آپ کے برادر نسبتی بن گئے ۔تو یہ رشتہ کیوں لائقِ مدح وستائش نہیں ؟ اور کیا اس رشتہ کا ثبوت ہر ایک کے نزدیک مسلم نہیں ہے ؟

برادر نسبتی کے علاوہ ایک دوسرا رشتہ ہم زلفی کا بھی ہے جیسا کہ ابوجعفر البغدادی نے لکھا ہے کہ حضرت ام سلمہ کی ایک علاتی بہن تھیں* قریبہ صغریٰ * یہ حضرت امیر معاویہ کے نکاح میں تھیں جن سے کوئی اولاد نہیں ہوئی (**کتاب المحبر ص 102**)....

گویا حضرت امیر معاویہ کا رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم سے براہ راست دو رشتہ تھا ایک رشتہ تھا برادر نسبتی کا اور دوسرا رشتہ تھا ہم زلفی کا.... یہ ہے تاریخ وسیر کی زبانی سسرالی رشتے کا پختہ ثبوت ......اب اگر رشتہ وتعلق کو فضیلت کی بنیاد بنایا جا سکتا ہے تو حضرت امیر معاویہ کی فضیلت کے لیے بھی ان رشتوں کو کافی سمجھنا چاہیئے ۔

رشتے کی فضیلت سے اب آگے بڑھیئے اور دیکھیئے کہ زبان رسالت سے کسی کی فضیلت بیان ہونے کی وجہ کیا ہے ؟ بس یہی نا ؟ کہ صاحبِ فضائل کے ساتھ فضائل کے مطابق برتاؤ کیا جائے ۔ایسا نہ ہو کہ اس کے ساتھ برتاؤ کرنے میں عام انسانوں جیسا رویہ ہو ۔اب اگر کسی کی کوئی فضیلت زبان سے تو بیان نہیں ہوئی مگر اسے کسی عظیم عہدہ پر فائز کر دیا گیا ہے تو ظاہر ہے کہ یہ اس کے فضل وکمال کا اعتراف بھی ہے اور اس کے مقام ومرتبہ کا اظہار بھی ....

حضرت امیر معاویہ کے لیے اگر مان ہی لیا جائے کہ زبانِ رسالت سے کوئی فضیلت ثابت نہیں ہے تو کیا یہ بھی ثابت نہیں ہے کہ آپ کاتبِ وحی تھے ؟ اور کیا کسی صحیح حدیث میں یہ بھی نہیں ہے کہ آپ مکتوبات نبوی کے محرر تھے ؟ اگر یہ ثابت ہے اور بیشک ہے جیسا کہ متعدد صحیح حدیثوں میں اس کی شہادت موجود ہے مثلاً مسند احمد کی صحیح حدیث میں ابن عباس کا جملہ ہے کہ* قال رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم اذھب فادعُ لی معاویۃَ وکان کاتِبَہٗ قال فَسَعَیْتُ الخ........مسند احمد ح 2651 *.....اسی لئے موافق ومخالف ہر ایک نے اسے تسلیم کیا ہے حتیٰ کہ قدیم شیعہ مؤرخ یعقوبی نے لکھا ہے کہ* **وکان کتّابہ الذین یکتبون الوحی والکتب والعھود علی بن ابی طالب**..........ومعاویہ بن ابی سفیان الخ......تاریخ یعقوبی ۔ج 2 ص 80 *......

جب یہ ثابت ہو گیا کہ آپ کاتب وحی تھے تو کیا وحی قرآنی کی کتابت پہ مامور ہونا نبی پاک کی طرف سے سندِ امانت نہیں ہے ؟ اور خطوط وفرامین کی تحریر پر متعین ہونا بارگاہِ نبوی کا وثیقہِ اعتماد نہیں ہوگا ؟ ۔کیوں نہیں ؟ ضرور ہوگا اس لئے کہ علماء کرام کا فیصلہ ہے کہ* کان لا یستکتب

الاعدلاً امیناً* ..... یعنی آپ صلی اللہ علیہ وسلم عادل اور امین کے علاوہ کسی کو کاتب نہیں بناتے تھے ..... ازالۃ الخفاء ص 147 ،اسی کے ساتھ امام طبرانی کی ایک روایت بھی ملا لیجئے کہ *عن ابن عباس قال جاء جبریل الی النبی صلی اللہ علیہ وسلم فقال یا محمد استوص معاویۃ فانہ امینٌ علی کتابِ اللہ ونعم الامینُ ھو........ المعجم الاوسط للطبرانی ح 3902 * .....اس حدیث میں واضح کر دیا گیا کہ حضرت امیر معاویہ امین ہیں...اسی لیے آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے آپ کو اپنا امین اور کاتب بنایا تھا....

علاوہ ازیں رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی جو دعائیں آپ کے حق میں صحیح احادیث سے ثابت ہیں ان کے بارے میں شاید ہی کسی مسلمان کو یہ بدگمانی ہو کہ وہ دعائیں قبول نہ ہوئی ہوں گی۔اس لئے ان دعاؤں کی روشنی میں ہمارا تو یہ ماننا ہے کہ حضرت امیر معاویہ کو آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے کئی سندیں عطا کی ہیں مثلاً (1) عالم الکتاب ہونے کی سند۔(2) عالم الحساب ہونے کی سند (3) عذاب سے محفوظ ہونے کی سند (4) حلیم و بردبار ہونے کی سند۔(5) اور ھادی ومھدی ہونے کی سند

چنانچہ امام بخاری نے اپنی کتاب التاریخ الکبیر میں لکھا ہے کہ ایک مرتبہ حضرت معاویہ رسول اللہ کے ساتھ کسی سواری پہ سوار تھے اس وقت آپ نے حضرت معاویہ سے پوچھا کہ میاں! تمہارے جسم کا کون سا حصہ میرے جسم سے ملا ہوا ہے تو آپ نے فرمایا کہ یا رسول اللہ میرا پیٹ آپ کے جسم سے مل رہا ہے تب آپ نے یوں دعاء فرمائی کہ اے اللہ! اس کے پیٹ کو علم اور حلم سے بھر دے...روایت کے الفاظ دیکھئے* كان معاويه ردف النبی صلی الله علیه و سلم فقال یامعاوية مايليني منك؟ قال بطني قال اللهم املاه علماً وحلماً....(ص 180 قسم 2۔ج۔4..نمبر 2624)

اسی طرح صحیح بن حبان میں ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا کہ اے اللہ معاویہ کو کتاب اور حساب کا علم عطا فرما اور اسے عذاب سے بچالے۔روایت کے الفاظ ہیں *عن العرباض بن ساریہ قال سمعت رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم یقول اللہم علّم معاویۃ الکتاب والحساب وقہ العذاب .... صحیح ابن حبان ح 7210 *

امام ترمذی نے یہ روایت نقل کی ہے کہ آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے حضرت معاویہ کے لیے یہ دعاء فرمائی کہ اے اللہ اسے ھادی ومھدی بنادے۔ *عَنْ عَبْدِ الرَّحْمَنِ بْنِ أَبِي عُمَيْرَةَ، وَكَانَ مِنْ أَصْحَابِ رَسُولِ اللَّهِ صَلَّى اللَّهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ عَنِ النَّبِيِّ صَلَّى اللَّهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ أَنَّهُ قَالَ لِمُعَاوِيَةَ: »اللَّهُمَّ اجْعَلْهُ هَادِيًا مَهْدِيًّا وَاهْدِ بِهِ... ترمذی شریف ح 3842

الغرض ان پانچ اسناد کے ہوتے ہوئے بھی اگر کوئی کہے کہ حضرت معاویہ کے لیے صحیح حدیث سے کوئی فضیلت ثابت نہیں تو یقیناً یہ تعصب کی بات ہوگی۔ورنہ سچ تو یہ ہے کہ جس کے لئے بھی صحابی ہونا ثابت ہوجائے اس کے لئے مزید کسی فضیلت کی ضرورت ہی نہیں ہے اس لیے کہ سندِ صحابیت سے بڑھ کر کوئی سند نہیں۔جس ذات کے لیے بھی دربار نبوت سے یہ سند جاری ہوچکی اسے ہر خیر اور جملہ فضائل کی ڈگری مل چکی ہے اب اس کے لئے مزید کسی فضیلت کی تلاش ایک بیکار شئی ہے نبوت کے بعد سب سے بڑی فضیلت کا مقام درجہ صحابیت ہے....

نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے جہاں بھی صحابہ کرام سے محبت کرنے کیلئے کہا ہے وہاں کسی کارنامے کا ذکر نہیں اور نہ ہی کسی اور فضیلت کا تذکرہ ہے بلکہ بنیاد صرف صحابیت ہے چنانچہ

اللّٰهَ اللّٰهَ فِي أَصْحَابِي، لَا تَتَّخِذُوا أَصْحَابِي غَرَضًا مَنْ أَحَبَّهُمْ، فَبِحُبِّي أَحَبَّهُمْ، وَمَنْ أَبْغَضَهُمْ فَبِبُغْضِي أَبْغَضَهُمْ، وَمَنْ آذَاهُمْ فَقَدْ آذَانِي، وَمَنْ آذَانِي فَقَدْ آذَى اللّٰهَ، وَمَنْ آذَى اللّٰهَ يُوشِكُ أَنْ يَأْخُذَهُ... صحیح ابن حبان ح 7256 ترمذی شریف ح 3862......وغیرہ میں محبت کی بنیاد کوئی اور فضیلت نہیں بلکہ صرف اور صرف صحابیت ہے اسی لئے ایک موقع سے نماز وتر کا واقعہ پیش آ گیا (وہ واقعہ رکعات وتر سے متعلق تھا جس میں ائمہ کے مابین اختلاف ہے) اور اتفاق سے وہ معاملہ حضرت امیر معاویہ ہی سے متعلق تھا۔لوگوں نے حضرت ابن عباس کے سامنے شکایت کی تو ابن عباس نے فرمایا کہ* دَعْہ فانہ قد صحب رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم.........بخاری شریف ح 3764*....یعنی چھوڑو۔کیونکہ معاویہ صحابی رسول ہیں۔دیکھئے۔یہاں ابن عباس نے امیر معاویہ کی صحابیت کو بنیاد بنایا اور فرمایا کہ وہ صحابی ہیں گویا علم ومعرفت کے سند یافتہ ہیں اس لیے انھوں نے جو بھی کیا ہے صحیح کیا ہے

بخاری شریف کی اس روایت سے مولانا سلمان ندوی صاحب کے اس خیال پہ بھی کاری ضرب لگتی ہے کہ امیر معاویہ طلیق ہیں صحابی نہیں مگر تعجب ہے کہ ابن عباس تو انہیں صحابی فرمائیں اور مولانا ہیں کہ انہیں صحابیت سے نکال کر طلقاء میں شامل کریں ظاہر ہے کہ یہ انصاف نہیں ہے

ایک دینی تحریف کا الزام

حُبِّ اہل بیت یقیناً محمود ہے اور خاندانِ رسول سے محبت رکھنا بیشک ایمان کا حصہ ہے مگر اس کا یہ مطلب نہیں کہ اس کی آڑ میں کسی بھی صحابی کے عیوب گنوائے جائیں اور ان کے معائب ومثالب کو مختلف پیرائے سے بیان کیا جائے۔صحابہ کرام بھی معصوم نہیں ہیں۔ان سے بھی غلطیاں ہوسکتی ہیں اور ہوئی بھی ہیں پھر مؤاخذہ بھی ہوا ہے لیکن جتنی غلطیوں پہ سزائیں ملی ہیں وہ سب کی سب غیر اجتہادی ہیں جبکہ زیرِ بحث معاملہ اجتہادی ہے اور اجتہادی خطائیں ہرگز قابلِ گرفت نہیں بلکہ ایسی خطاؤں سے زبان وقلم کو روک لینا ہی اسلامی مزاج ہے

اس کے برخلاف مولانا سلمان ندوی صاحب نے اپنے نئے کتابچہ میں لکھا ہے کہ* دوسری ایک غلط فہمی اس: لَاتَسُبُّوا: والی حدیث سے یہ پیدا ہوئی کہ جسے اس عمومی اصطلاحی معنی میں صحابی کہہ دیا گیا اس کی برائی اور اس کے غلط عمل کا تذکرہ نہیں ہونا چاہیے۔یہ خطرناک دینی تحریف ہے اور قرآن کی آیات اور احادیث نبوی کے بالکل خلاف ہے الخ....(ص 12)۔اس کے بعد مولانا نے دور رسالت کی چند مثالیں پیش کی ہیں پھر فرمایا ہے کہ* کسی بھی شخص کے بارے میں فیصلہ قرآنی آیات کی روشنی میں ہوگا غلط غلط ہے۔.کسی سے بھی سرزد ہو۔حق حق ہے۔کوئی بھی صاحبِ حق ہو۔یہ عالمی۔دائمی اور ابدی اصول ہیں جو صحابہ کی وضع کردہ اصطلاح سے کبھی نہیں بدلے گئے۔(ص 14)

مولانا نے اپنے اس چھوٹے سے کتابچہ میں ایک الزام تو یہ لگایا تھا کہ صحابی کی تعریف میں اہل سنت نے غلو سے کام لیا ہے اور اہل سنت کی بیان کردہ تعریف کسی بھی حدیث سے ثابت نہیں ہے۔مولانا کے اس الزام پر دوسری قسط میں تفصیل سے گفتگو آ چکی ہے اور اب یہ دوسرا الزام ہے کہ کسی بھی صحابی کے غلط عمل کو بیان نہ کرنے کا تصور ایک*خطرناک دینی تحریف* ہے جو کہ لَاتَسُبُّوا کا صحیح مفہوم نہ سمجھنے کا نتیجہ ہے۔

مولانا سلمان ندوی صاحب یقیناً بڑے ہیں علم وفہم میں بھی اور اخذ واستنباط میں بھی۔۔اس کے باوجود مجھ جیسے چھوٹوں کو بھی ہنسی آ رہی ہے مولانا کے استدلال پہ....کیونکہ مسئلہ ہے اجتہادی خطاؤں کا۔اور استدلال ہے حدود شرعیہ کے واقعات سے۔گفتگو ہے صحابہ کی اجتہادی

غلطیوں پہ سب وشتم کی۔اور مثال پیش کی گئی ہے حضرت ماعز اسلمی کی سنگساری کی۔حضرت مسطح کے الزام تہمت کی۔حضرت ہلال بن امیہ کے واقعہ لعان کی۔حضرت قدامہ بن مظعون کی شراب نوشی کی.....ایسا لگتا ہے کہ مولانا نے جذبات کی رو میں یہ بھی نہیں سوچا کہ ہمارے دعویٰ ودلیل کو دیکھ کر چھوٹوں کا تاثر کیا ہوگا؟اور شاید مولانا کو یہ خیال ہی نہیں رہا کہ اس *خطرناک دینی تحریف* کے جواب میں اجتہادی غلطیوں پر سب وشتم کی کوئی دلیل بھی پیش کردیں...

مولانا کی خدمت میں بصد احترام یہ عرض ہے کہ آپ نے جو دعویٰ کیا ہے وہ بلا دلیل ہے اور جو دلیل پیش کی ہے اسے آپ کے دعویٰ سے کوئی تعلق نہیں۔کیونکہ مسئلہ حدود وقصاص کا نہیں ہے...مسئلہ ثابت شدہ احکام شرعیہ کا نہیں ہے اور بحث کسی ایسے مسئلہ کی نہیں ہے جس میں کسی صحابی نے قرآن وحدیث سے ثابت کسی مسئلہ کی خلاف ورزی کی ہو.....بلکہ مسئلہ ہے اجتہاد کا...معاملہ ہے اختلاف رائے کا...اور گفتگو ہے اجتہادی غلطی کی.........

جبکہ ہم دیکھتے ہیں کہ جس قرآن وحدیث کے نام سے آپ نے جمہور امت پر *خطرناک دینی تحریف* کا الزام عائد کیا ہے اسی حدیث میں سرکار دوعالم صلی اللہ علیہ وسلم نے من وعن وہی حکم دیا ہے جس کے قائل جمہور امت ہیں یعنی صحابہ کرام کی اجتہادی غلطی سے کف لسان کرو۔اسے زبان پہ ہرگز نہ لاؤ اور اسے چھیڑنے سے گریز کرو۔امام طبرانی نے حسن درجہ کی ایک روایت نقل کی ہے کہ

عَنْ عَبْدِ اللهِ قَالَ: قَالَ رَسُولُ اللهِ صَلَّى اللهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ: »إِذَا ذُكِرَ أَصْحَابِي فَأَمْسِكُوا، وَإِذَا ذُكِرَتِ النُّجُومُ فَأَمْسِكُوا، وَإِذَا ذُكِرَ الْقَدَرُ فَأَمْسِكُوا« (المعجم الكبير للطبرانی ح 10448)

یعنی میرے صحابہ کا جب ذکر آئے تو ان پر طعن کرنے سے اپنی زبانیں روک لو۔جب ستاروں کا ذکر آئے تو بھی اپنی زبانیں روک لو اسی طرح جب تقدیر کا مسئلہ چھڑے تو بھی زبانیں روک لو...........اس حدیث میں صاف صاف حکم دیا جارہا ہے کہ کوئی تبصرہ نہ کرو۔زبانیں خاموش رکھو اور اپنے آپ کو روک لو....اب اگر جمہور نے لاتسبوا کا مطلب بیان کرتے ہوئے یہی بات کہہ دی تو *تحریف* کیسے ہوگئی؟ یہ تو خود فرمانِ رسول کی تعمیل ہے اور براہ راست شارع اسلام کی پیروی ہے...

ایک موقع سے حضرت عائشہ کے سامنے کچھ لوگوں نے بعض صحابہ کرام کو برا بھلا کہنا شروع کیا تو حضرت عائشہ نے فرمایا کہ *»أُمِرُوا أَنْ يَسْتَغْفِرُوا لِأَصْحَابِ النَّبِيِّ صَلَّى اللهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ فَسَبُّوهُمْ« (مسلم شریف ح 3022)* یعنی افسوس ہے لوگوں پر کہ اصحاب نبی کے لیے انہیں استغفار کا حکم دیا گیا ہے مگر لوگ ان کی برائی کررہے ہیں...اس روایت میں حضرت عائشہ کا تاثر کیا ہے؟ یہی نا؟ کہ صحابہ کو برا بھلا نہیں کہنا ہے بلکہ ان کی خطاؤں پر مغفرت طلب کرنی ہے..اب اگر یہی بات جمہور نے کہہ دی تو *خطرناک دینی تحریف* کیسے ہوئی؟

مولانائے محترم! آپ کے علم وشہرت کے سامنے میری کوئی حیثیت نہیں اس کے باوجود یہ عرض ہے کہ پہلے آپ خود ہی اپنے اندر جھانک کر دیکھئے کہ کہیں آپ ہی کی غلط فہمی تو نہیں ہے؟ اور دوسروں پر الزام تھوپنے سے پہلے یہ بھی سامنے رکھئے کہ اس کی گاد کہاں کہاں گرے گی؟ اور آپ کے *خطرناک دینی تحریف* کے الزام سے کون کون مجروح ہونگے؟ مثلاً امام احمد بن حنبل کو لیجئے کہ جو محدث بھی ہیں فقیہ بھی۔اور

جن کی روایت ودرایت پہ سبھوں کو مکمل اعتماد ہے وہ فرماتے ہیں کہ *وَقَالَ الْمَيْمُونِيُّ قَالَ لِي أَحْمَدُ بْنُ حَنْبَلٍ: يَا أَبَا الْحَسَنِ إِذَا رَأَيْتَ رَجُلًا يَذْكُرُ أَحَدًا مِنَ الصَّحَابَةِ بِسُوءٍ فَاتَّهِمْهُ عَلَى الْإِسْلَامِ. (البدایہ والنہایہ ج 8 ص 139)* یعنی میمونی سے امام احمد نے فرمایا کہ اے ابوالحسن جب تم دیکھو کہ کوئی شخص کسی صحابی کی برائی کر رہا ہے تو سمجھ لو کہ اس کا اسلام متھم ہے یعنی اس کا ایمان مشکوک ہے..... اسی طرح ایک اور محدث وفقیہ حضرت امام مالک فرماتے ہیں کہ

من شتم اصحابه ادب وقال ايضاً من شتم احدا من أصحاب النبى صلى الله عليه وسلم ابابكر اوعمر أو عثمان أو معاويه أو عمرو بن العاص فان قال كانوا فى ضلال قتل وان شتم بغير هذا من مشاتمة الناس نكل نكالا شديدا (رسائل ابن عابدين شامى ج 1 ص 358 تحت الباب الثانى فى حكم ساب احد من الصحابه)

یعنی حضرت امام مالک فرماتے ہیں کہ جو شخص صحابہ کرام کو سب وشتم کرے اس کی تادیب کی جائے۔ نیز فرمایا کہ جو شخص نبی کریم کے اصحاب میں سے کسی ایک صحابی حضرت ابوبکر۔ حضرت عمر۔ حضرت عثمان۔ حضرت معاویہ اور حضرت عمرو بن العاص کے حق میں یہ کہے کہ وہ گمراہی پر تھے تو اسے قتل کیا جائے لیکن اگر اس کے علاوہ عام لوگوں کی طرح برا بھلا کہے تو اسے سخت سزا دی جائے۔

حضرت امام شافعی کی بھی یہ ھدایت کتابوں میں مذکور ہے کہ تلك دما طهر الله ايدينا فلنطهر عنها السنتنا (شرح مواقف المقصد السابع ج8 ص 374)

یعنی یہ وہ خوں ریزیاں ہیں جن سے اللہ پاک نے ہمارے ہاتھوں کو محفوظ رکھا ہے اس لئے ہمیں چاہیے کہ ہم اپنی زبانوں کو بھی محفوظ رکھیں اور مشاجرات صحابہ کا کوئی ذکر نہ کریں۔

اب غور فرمائیے کہ امام الدرایۃ والروایۃ تو یہ کہیں کہ سب وشتم کی اجازت نہیں۔ زبانوں پہ تالا ڈالنا ضروری ہے۔ اگر کوئی برا بھلا کہتا ہے تو اسے سخت سزا دی جائے گی اور وہ اپنے ایمان کی بھی خیر منائے...... اور حضرت ندوی یہ فرمائیں کہ یہ خطرناک دینی تحریف ہے۔ سمجھ سے بالاتر ہے۔ کیونکہ مولانا ندوی کا الزامِ تحریف سب سے پہلے امامان زمانہ پہ لگے گا اور مولانا ندوی کے خنجر تحریف سے زخمی ہونے والوں میں امام مالک امام شافعی اور امام احمد کا نام سرفہرست ہوگا۔

علاوہ ازیں جن اہل بیت کی محبت میں مولانا ندوی نے اتنی اہم جرآت کی ہے خود وہ بھی تو یہی فرماتے ہیں کہ ہمارے مقابل جو لوگ تھے وہ بھی حق پر تھے اور انہیں منافق بھی نہیں کہا جاسکتا ہے چنانچہ امام قرطبی نے نقل کیا ہے کہ *سُئِلَ عَلِيٌّ بْنُ أَبِي طَالِبٍ رَضِيَ اللَّهُ عَنْهُ وَهُوَ الْقُدْوَةُ عَنْ قِتَالِ أَهْلِ الْبَغْيِ مِنْ أَهْلِ الجمل وصفين: أمشركون هم؟ قَالَ: لَا، مِنَ الشِّرْكِ فَرُّوا. فَقِيلَ: أَمُنَافِقُونَ؟ قَالَ: لَا، لِأَنَّ الْمُنَافِقِينَ لَا يَذْكُرُونَ اللَّهَ إِلَّا قَلِيلًا (تفسیر قرطبی ج 16 ص 323)*

یعنی حضرت علی سے پوچھا گیا کہ صفین وجمل میں آپ کے مقابل کیا مشرک ہیں؟ تو فرمایا نہیں نہیں وہ لوگ تو شرک سے بھاگے ہیں۔ پھر پوچھا گیا کہ کیا وہ منافق ہیں فرمایا نہیں منافق بھی نہیں ہیں اس لیے کہ منافقین تو اللہ کو بہت کم یاد کرتے ہیں جبکہ یہ لوگ ذاکرین ہیں...

یہاں موقع تھا برائی کا اس کے باوجود حضرت علی نے فرمایا کہ یہ لوگ منافق بھی نہیں بلکہ ذاکرین میں سے ہیں کیونکہ خود حضرت علی جانتے تھے کہ ہمارا اور حضرت معاویہ کا اختلاف کوئی حق و باطل کا اختلاف نہیں بلکہ محض غلط فہمیوں کا اختلاف ہے اس لئے وہ بھی حق پہ ہیں اور ہم بھی حق پہ ہیں چنانچہ حضرت امام جعفر صادق اپنے والد امام باقر سے نقل کرتے ہیں کہ* **سمع علی یوم الجمل او یوم الصفین رجلاً یغلوا فی القول فقال لا تقولوا الا خیرا فانھم قوم زعموا انا بغینا علیھم وزعمنا انھم بغوا علینا فقاتلناھم (منہاج السنۃ لابن تیمیہ ج3 ص61)**

یعنی حضرت علی نے جمل یا صفین کے موقع سے کسی کو غلو کرتے ہوئے سنا (مقابلین کے بارے میں برا بھلا کہتے ہوئے سنا) تو آپ نے فرمایا کہ مقابلین کے لیے خیر کے سوا کچھ مت کہو کیونکہ ہم دونوں حق پہ ہیں..... یہاں خود حضرت علی نے سب وشتم سے روکا ہے اور خیر ہی خیر کہنے کی تلقین فرمائی ہے....... اب بتلایئے کہ مولانا ندوی نے جو یہ فرمایا ہے کہ حق حق ہے غلط غلط ہے اور غلطی کرنے والے کو برا کہنا غلط نہیں ہے تو بقول حضرت علی دونوں ہی حق پر ہیں۔ پھر غلط آخر ہے کون؟ جن کو آپ غلط کہہ رہے ہیں ان کو تو خود حضرت علی حق پہ کہہ رہے ہیں.....اسی طرح سب وشتم نہ کرنے کو جو آپ نے دینی تحریف کہا ہے تو کیا خود حضرت علی ہی پر آپ کی تلوار نہیں ٹوٹتی؟ کیونکہ سب وشتم کرنے والے کو آپ نے روک دیا ہے اور فرمایا ہے کہ* **لا تقولوا الا خیرا***

قرآن کو مشکوک ٹھہرانے کا حربہ

دشمنانِ قرآن نے ہر دور میں اس پہ حملے کئے ہیں۔ اس کی حقانیت کو چیلنج کیا ہے اور اسے غیر معتبر ٹھہرانے کی تدبیریں کی ہیں مگر قرآن کی لاریبیت نے اپنے دشمنوں کو ہمیشہ ہی منہ چڑھایا ہے اور تشکیکی ذھنیت والوں کو شرمندہ کیا ہے....... پر.......دشمن جب دوست کے روپ میں ہو۔ مخالف جب موافقین کی صف میں ہو اور حملہ آور ہی محافظین کا جنرل ہو تو پھر معاملہ بہت دشوار ہو جاتا ہے کیونکہ جب دشمن کا امتیاز ہی نہیں تو دفاع اور مقابلہ کیسے کیا جائے؟

ساری دنیا جانتی ہے کہ قرآن کریم کے پارے 30 اور سورتیں 114 ہیں۔ جو کہ مشہور بھی ہے متوارث بھی۔ اب اگر اہل سنت والجماعت ہی کا کوئی اہم فرد اچانک یہ کہہ دے کہ قرآن کی سورتیں 114 نہیں ہیں تو یقیناً عجیب سا لگے گا۔ اسی طرح پاروں کے 30 ہونے کا وہ انکار کر دے تو بھی تعجب ہوگا کہ یہ کیا نئی بات سننے کو مل رہی ہے؟ یہ کون سا نیا راگ الاپا جا رہا ہے؟ اور کہاں سے یہ نیا شوشہ پیدا کر دیا گیا ہے؟ کیونکہ اس طرح کی باتیں کرنا تو اہلِ تشیع کا کام ہے اور قرآن کریم میں کمی وبیشی کا عقیدہ تو شیعوں کا ہے۔ پھر کیسے کسی سُنّی نے ایسی بات کہہ ڈالی؟

تاہم اس میں کوئی تعجب کی بات نہیں۔ اس لیے کہ ایک تو یہ علمی موضوع ہے۔ اور دوسرے کہنے والے بھی کوئی عام انسان نہیں بلکہ ایک ایسے نامور عالم دین ہیں جن کے یہاں اس طرح کی باتوں کا آئے دن ظاہر ہوتے رہنا کوئی نئی چیز نہیں ہے۔ اور وہ ہیں مولانا سلمان ندوی الحسینی صاحب۔ مولانا کو ہم قرآن کا مخالف نہیں کہتے بلکہ محافظ وترجمان سمجھتے ہیں لیکن انھوں نے اپنے نئے کتابچہ میں قرآنی سورتوں کی تعداد پر جو انگلی اٹھائی ہے وہ علمی دنیا میں خواہ کتنا ہی باوزن ہو۔ تشکیک کا پیش خیمہ اسے ضرور کہا جائے گا اور اجماع امت سے ہٹ کر کوئی

نئی راہ اپنانا یقیناً کسی طوفان وسازش کا پتہ دیتا ہے
مولانا نے اپنے نئے کتابچہ میں لکھا ہے کہ (صحابی کی جو تعریف اہل سنت نے کی ہے) * وہ تعریف نہ تو حضور سے منقول ہے نہ خلفاء راشدین سے نہ کسی صحابی سے۔ بعد کے دور میں یہ تعریف وضع کر لی گئی ہے بالکل ایسے ہی جیسے کہ قرآن میں 114 سورتیں ہیں۔ اب یہ قول کہ اس میں 30 پارے ہیں اور وہ بھی ایک خاص ترتیب کے ساتھ۔ ایک چلی ہوئی بات ہے۔ نہ حضور نے یہ فرمایا۔ نہ صحابہ نے۔ نہ تابعین نے۔ دلچسپ بات یہ ہے کہ ایک مجہول غیر عالم شخص نے معنوں کا لحاظ نہ کرتے ہوئے ساتویں صدی میں قرآن پاک کے تیس حصے کر دیئے۔ اس کا ایسا چلن ہوا جیسے کہ یہ متفق علیہ رائے ہے....... لفظ صحابہ کے بارے میں غلط فہمیاں ص 10.9
مولانا کے مندرجہ بالا اقتباس پہ غور کیجئے کہ انھوں نے یہ باور کرانے کی کوشش کی ہے کہ قرآن پاک میں 114 سورتیں نہیں ہیں۔ اور 114 کا جو مشہور چلن ہے بالکل بے بنیاد ہے۔ یہ تعداد نہ تو حضور سے ثابت ہے نہ صحابہ وتابعین سے..... اب سوال یہ ہے کہ اگر سورتیں 114 نہیں ہیں تو پھر کتنی ہیں؟..... مگر افسوس کہ انھوں نے اسے گول کر دیا اور کوئی تعداد نہیں بتائی۔ جبکہ یہ موقع تھا تعداد بتانے کا... اس لیے ایسا لگتا ہے کہ مولانا نے امت مسلمہ کو شک وشبہ میں مبتلا کرنے کی ایک ناکام کوشش کی ہے اور قرآن کریم کو مشکوک ٹھہرانے کی لاحاصل سعی کی ہے حالانکہ سورتوں کی اس تعداد پہ نہ صرف یہ کہ پوری امت کا اجماع ہے بلکہ جمہور صحابہ کرام سے یہی 114 کی تعداد ثابت ہے۔
علامہ الزرکشی لکھتے ہیں کہ *واعلم أن عدد سور القرآن العظیم باتفاق اهل الحل والعقد مائة واربع عشرة سورة كما هي في المصحف العثماني (البرهان ج 1 ص 251)*
یعنی قرآن عظیم کی سورتوں کی تعداد بالاتفاق 114 ہیں جیسا کہ یہی تعداد مصحف عثمانی میں ہے... الدکتور محمد سلیم لکھتے ہیں کہ *فالجمهور على ان الاجمالى لسور القرآن 114 مائة وأربع عشرة سورة.... وهذا هو القول الصحيح الذى لا ينبغي العدول عنه (تاريخ القرآن الكريم ص 64)*
یعنی جمہور اس بات پر ہیں کہ قرآن کی سورتیں 114 ہیں اور یہی صحیح قول ہے جس سے ہٹنا مناسب نہیں
امام سیوطی لکھتے ہیں کہ *اما سوره فمائة واربع عشرة سورة بإجماع من يعتد به (الإتقان ج 1 ص 184)*
یعنی قرآن کی سورتیں بالإجماع 114 ہیں۔
اس طرح جس کتاب کو بھی اٹھایئے ہر جگہ آپ کو یہی ملے گا کہ تیسرے خلیفہ راشد حضرت عثمان غنی رضی اللہ عنہ نے جو مصحف تیار کیا تھا اور جس پر اس وقت کے تمام صحابہ نے اتفاق کیا تھا اس میں یہی 114 کی تعداد ہے پھر مولانا ندوی کا یہ دعویٰ کیسے درست ہو سکتا ہے؟ کہ یہ 114 کی تعداد نہ حضور سے ثابت ہے اور نہ ہی صحابہ سے.......
ممکن ہے کہ حضرت ابی بن کعب اور حضرت عبداللہ بن مسعود کے ذاتی مصحف کو سامنے رکھتے ہوئے کوئی یہ کہے کہ حضرت ابی بن کعب کے مصحف میں سورتوں کی تعداد 116 تھی کیونکہ انھوں نے *اللهم انا نستعينك الخ* اور *اللهم اياك نعبد الخ* کو بھی ایک ایک سورۃ کے طور پر اپنے مصحف میں لکھ رکھا تھا اسی طرح ابن مسعود نے اپنے مصحف سے معوذتین کو رقیہ اور جھاڑ پھونک سمجھتے ہوئے الگ

رکھا تھا اور صرف 112 سورتیں لکھی تھیں اسی طرح بعض لوگوں کے نزدیک سورہ برآۃ اور سورہ انفال دونوں ایک ہی سورۃ ہے اس لئے کل 113 سورتیں ہونگیں......

الغرض ابن مسعود اور ابن کعب وغیرہ کے ذاتی مصحف اور عثمان غنی کے سرکاری مصحف میں اس طرح کے دو چار معمولی اختلاف کو چھوڑ کر کوئی ادنی سے ادنی اختلاف بھی امت میں کبھی نہیں رہا اور تمام صحابہ نے مصحف عثمانی ہی کو قبول کیا اسی لئے لوگوں نے لکھا ہے کہ *ان الصحابة اجمعوا علی المصحف الذی کتب فی عهد عثمان ولم یخالف منهم احد........ وعدلوا عن مصاحفهم واحرقوها ورجعوا الی مصحف عثمان الخ (مناهل العرفان ج 1 ص 354)*

یعنی تمام صحابہ نے اسی مصحف پر اتفاق کیا جو حضرت عثمان کے زمانہ میں سرکاری سطح پر لکھا گیا تھا اور صحابہ میں سے کسی نے کوئی مخالفت نہیں کی..... حتی کہ سبھوں نے اپنے اپنے مصاحف کو جلا کر مصحف عثمانی کو اپنا لیا

خود ابن مسعود اور ابن کعب نے بھی حضرت عثمان غنی کے سرکاری مصحف سے کبھی اختلاف نہیں کیا حالانکہ مصحف عثمانی میں سورتوں کی تعداد ان دونوں کے ذاتی مصحف کی تعداد سے الگ تھی۔ اگر مصحف عثمانی میں سورتوں کی تعداد غلط ہوتی اور نزولی یا رسولی تعداد کے خلاف ہوتی تو یہی دونوں نہیں بلکہ دوسرے صحابہ بھی ہرگز ہرگز مصحف عثمانی کو قبول نہ کرتے۔ گویا 114 سورتوں کی تعداد پر صحابہ کرام کا اجماع ہے اور صحابہ کرام کا اجماع ایک مستقل حجت شرعیہ ہے اس لیے اس تعداد میں کسی بھی قسم کے شک کی گنجائش نہیں

مولانا ندوی نے موجودہ قرآن کو مشکوک بنانے کے لئے 30 پاروں کی تقسیم پر بھی اپنا غصہ اتارا ہے مگر غصہ اتارتے ہوئے بھی نہایت ہوشیاری کا ثبوت دیا ہے اور وہ اس طور سے کہ انھوں نے فرمایا* ایک مجہول غیر عالم شخص نے معنوں کا لحاظ نہ کرتے ہوئے ساتویں صدی میں قرآن پاک کے تیس حصے کر دیئے*............ یہاں مولانا کی کمال ہوشیاری دیکھئے کہ ساتویں صدی کہا ہے اور عیسوی وھجری کی تعیین نہیں کی ہے اب جو بھی اسے پڑھے گا وہ یہی سمجھے گا کہ ساتویں صدی ہجری مراد ہے کیونکہ دور رسالت یا دور صحابہ وغیرہ کے ضمن میں جب کوئی صدی بولی جائے گی تو بالعموم ہجری ہی صدی مراد لی جائے گی لہذا ساتویں صدی ہجری سے یہ تاثر قائم ہوگا کہ کافی زمانے کے بعد یہ تقسیم ہوئی ہے اور دور رسالت سے پانچ چھ سو سال بعد یہ 30 پارے بنائے گئے ہیں اس لیے واقعۃً یہ غیر معتبر ہے

حالانکہ ساتویں صدی سے عیسوی صدی مراد ہے اور اسی ساتویں صدی عیسوی یعنی 632ء میں رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی وفات بھی ہے گویا ابھی سو سال بھی نہیں گذرنے پایا تھا کہ پاروں کی تقسیم ہوگئی تھی اور چونکہ رسول اللہ کی وفات کے بعد سو سال تک کا زمانہ دور صحابہ کہلاتا ہے اس لئے دور صحابہ ہی میں یہ تقسیم بھی ہوئی........ مگر چونکہ اس تفصیل کو سامنے رکھنے سے کسی قسم کا شک پیدا نہیں ہوتا اس لیے نہ ہجری کی صراحت ہوئی اور نہ عیسوی کی تعیین ہوئی تا کہ تیر نشانہ پہ بھی لگے اور بات غلط بھی نہ ہو

قرآن مجید کو 30 پاروں میں کب تقسیم کیا گیا؟ اس سلسلے میں حضرت مولانا تقی عثمانی صاحب لکھتے ہیں کہ* بعض حضرات کا خیال ہے کہ حضرت عثمان غنی رضی اللہ عنہ نے مصاحف نقل کراتے وقت انہیں تیس مختلف صحیفوں میں لکھوایا تھا لہذا یہ تقسیم آپ ہی کے زمانے (دور عثمانی) کی ہے لیکن متقدمین کی کتابوں میں اس کی کوئی دلیل احقر کو نہیں مل سکی (علوم القرآن ص 196)*

تاہم یہ بات درست ہے کہ پاروں والی تقسیم مصحف عثمانی میں نہیں تھی البتہ صحابہ کے زمانہ میں یہ تقسیم ہو چکی تھی جو کہ محض تلاوت کی آسانی کے لئے کی گئی تھی لیکن تقسیم کس نے کی ہے؟ یقین کے ساتھ کوئی ایک بات نہیں کہی جا سکتی. مگر جس نے بھی کی ہے فرمان رسول کے اشارات کو سامنے رکھ کر کی ہے. حدیث پاک میں آتا ہے کہ* عَنْ عَبْدِ اللَّهِ بْنِ عَمْرٍو، قَالَ: قَالَ رَسُولُ اللَّهِ صَلَّى اللهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ »اقْرَإِ القُرْآنَ فِي شَهْرٍ« قُلْتُ: إِنِّي أَجِدُ قُوَّةً حَتَّى قَالَ: »فَاقْرَأْهُ فِي سَبْعٍ وَلاَ تَزِدْ عَلَى ذَلِكَ.

(بخاری شریف ح 5054)

یعنی عبداللہ بن عمرو فرماتے ہیں کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا کہ قرآن کو ایک مہینہ میں ختم کیا کرو. تو حضرت عبداللہ نے کہا کہ مجھ میں اور بھی جلدی ختم کر لینے کی طاقت ہے تو آپ نے فرمایا کہ پھر سات دن میں مکمل کیا کرو...... اس حدیث میں قرآن مجید کو مکمل کرنے کا سب سے پہلا حکم یہ ہے کہ ایک ماہ میں مکمل کرو تو ظاہر ہے جس نے بھی تقسیم کی ہے وہ یقیناً اس حدیث سے واقف تھا تبھی تو تیس ہی میں تقسیم کیا. نہ کم میں کیا نہ زیادہ میں. کیونکہ رسول اللہ کا ارشاد اس کے سامنے تھا اس کے باوجود مولانا فرماتے ہیں کہ وہ غیر عالم تھا اسی لیے اس نے معنوں کی رعایت نہیں کی....... مگر یہ بھی تو دیکھئے کہ اگر معنی کی رعایت کی جاتی تو شاید اتنی برابری قائم نہیں رہ سکتی بہر حال 30 پاروں کی تقسیم جس نے بھی کی ہو اس سے ہمیں کوئی بحث نہیں مگر یہ بات طے شدہ ہے کہ یہی تیس پارہ کامل و مکمل قرآن ہے جس کی شان یہ ہے کہ* لا یاتیہ الباطل من بین یدیہ ولا من خلفہ تنزیل من حکیم حمید*